فہمیدہ ریاض



مکتبہ دانیال

بدن دریده



فہمیدہ ریاض

بدن دریدہ





مکتبۂ دانیال

چوتھا ایڈیشن

سنہ ۱۹۷۹ء

قیمت : ۹ روپے

*

ناشر :۔ ملک نورانی، مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲،
عبداللہ ہارون روڈ، کراچی ۳
طابع :۔ ناظر پرنٹنگ پریس کراچی

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

غالبؔ

"I know the bottom, she said,
I know it with my great tap-root,
It is what you fear? I do not
fear it. I have been there."

Sylvia Plath

غزلیں

سُارہ کے نام



پیش لفظ

میری نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ نام تھا اس کا "پتھر کی زبان" موجودہ کتاب میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک کی تقریباً تمام نظمیں شامل ہیں۔ گویا یہ پچاس کے قریب نظمیں چھ برسوں پر محیط ہیں۔ آپ اسے "پتھر کی زبان" سے مختلف قسم کی کتاب پائیں گے۔ اس کے بعض موضوعات پر چند لوگوں کو بہت اعتراض ہے۔ اُن کے خیال میں یہ فحش ہیں۔ یا چونکانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ آئیے پہلے تو ہم غور کریں کہ ہم لکھتے کیوں ہیں۔ تفریحِ طبع کے لیے؟ شہرت کے لیے؟ یہ درست نہیں ہے۔ دراصل شاعر ایک دیوار سے اپنا سر پھوڑتا ہوا خود کلامی کرتا ہے۔ اس عمل میں صرف اس کا اپنا مکمل وجود شامل ہے۔ اس کا دماغی اور جذباتی وجود۔ جو اس کی روح ہے اور اس کا جسمانی وجود جسے اس کی روح نے ایسے گھیرا ہے جیسے سمندر کا پانی کسی جزیرے کو گھیرتا ہے۔ اس کی نظم پڑھنے یا سننے والے اس عمل میں کہیں شریک نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو صرف اس حد تک کہ اس کی روح کی ارتقاء میں سارے معاشرے کی اخلاقی اقدار حصّہ لیتی ہیں اور اس کے الجھاوے ان اقدار کے باہم ٹکراؤ اور تضاد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان تضادات میں شاعر تنہا نہیں اُلجھا ہوتا۔ جب اخلاقی

اقدار اپنی حقیقی روح کھو کر محض رواج بن کر رہ جاتی ہیں تو اس کو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے، بکھرتے ہوئے معاشرے میں ہر فرد اپنے آپ کو اسی کرب کا شکار پاتا ہے۔ اسی خلفشار میں وہ زندگی کرنے کی کوئی ترکیب نکالتا ہے۔ آخری عمر کو پہنچتے پہنچتے بیشتر لوگ مذہبی ہو جاتے ہیں۔ یا ایسے کاموں میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی کوشش کرتے ہیں جن کا براہِ راست ان کی روحانی کش مکش سے تعلق نہ ہو۔ مثلاً اپنے پیشے یا کاروبار کے لئے خود کو وقف کر دیتے ہیں۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں کچھ لوگ اپنے پیشے کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا کمہار جسے زندگی کی ساری خوبصورتی چاک پر گھومتے برتن میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسا ڈاکٹر جو لاعلاج مرض کی دوا کی دریافت میں ساری عمر گزار دیتا ہے۔ یا ایسا وکیل جسے قانون کی باریکیاں سمجھنے اور ان میں پوشیدہ سینکڑوں معانی کے بیان کرنے میں روحانی مسرت ملتی ہے۔ یہ سب زندگی کو معنی دینے کی کامیاب انسانی کوششیں ہیں اور ہر مرتبہ معاشرے کی گرتی ہوئی دیواروں کو ان ہی کوششوں نے سہارا دیا ہے۔ ادیب۔ شاعر۔ فلسفی اور آرٹسٹ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مگر ان کا زندگی کرنے کا طریقہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ وہ ایک جوش و خروش سے احتجاج کی صدا بلند کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے کبھی احتجاج کا نعرہ نہ لگایا ہو وہ کبھی یہ نہیں جان سکتے کہ یہ کیسی جگر خراش صدا ہوتی ہے۔ کہ یہ نعرہ بلند کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ محسوس کرنے اور صدائے احتجاج کے لب تک آنے کے دوران آدمی پر کیا گزر جاتی ہے۔ اس سے وہ کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ ہاں جس وقت وہ یہ صدا بلند کرتا ہے۔ وہ لمحہ، جب وہ اپنے سینے میں گول گول

گھومتی، اپنے بدن کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی اس آواز کو آزاد کرنا ہے۔ بے شک سرخوشی کی انتہا کا لمحہ ہے۔ تب وہ اپنے آپ سے اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ جیسے شعلہ لپک کر بلند ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا جلال اور اس کا جمال دیدنی ہوتا ہے۔ یہی لمحہ جو آپ اپنی داد ہے اس کے تمام تر کرب کا صلہ ہے۔

معاشرے نے جو ادب اور آرٹ پیدا کیا ہے۔ یہ وہی دیوار ہے اور وہی شوریدہ سر فنکاروں کا پیہم سر ٹکرانا۔ لیکن ایک سچائی اٹل ہے۔ وہ یہ کہ جب سر سلامت نہیں رہتے تو دیوار کیسے سلامت رہ سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑی کھوکھلی دیوار ہے اور بالآخر ٹوٹ جاتی ہے۔

کارگاہِ ہستی میں کس حساس ذی روح پر وہ مقام نہیں آیا ہوگا جب اس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو۔ جب اُسے اپنے وجود کی قیمت نقد جاں سے نہ چکانی پڑی ہو۔ لیکن جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنا دیں۔ آخری سانس تک جنگ کریں۔ سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں ایک رجز ہیں جسے بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری۔ اس لحاظ سے "بدن دریدہ" ایک رزمیہ ہے۔ اسے پڑھ کر اگر لوگ چونکے تو کیا بُرا ہوا۔

فہمیدہ ریاض

تصویر

مرے دل کے نہاں خانے میں اِک تصویر ہے میری
خدا جانے اسے کس نے بنایا، کب بنایا تھا
یہ پوشیدہ ہے میرے دوستوں سے اور مجھ سے بھی
کبھی بھُولے سے لیکن میں اسے گر دیکھ لیتی ہوں
اسے خود سے ملاؤں تو مرا دل کانپ جاتا ہے

دِل سرد ھوا

دل سرد ہوا
اب شام حسیں
آئے بھی تو کیا
سینے میں کہیں
وہ درد نہیں
دن بیت گئے
میں نے اس کو
کب یاد کیا
آنکھوں میں مری
اس کی صورت
دھندلا سی گئی

ہاں دل میں مرے
وہ عشق کی لو
جو دائم تھی
کچلا سی گئی
اب دل ہے مرا
صحرا صحرا
معبود مرے
جس جا میں ہوں
اس جا کتنا
سنّاٹا ہے

عشق، آوارہ مزاج

عشق، آوارہ مزاج
وہ مسافر تو گیا!
نہ کوئی اس کی مہک ہے کہ جو دے اس کا پتہ
نہ کوئی نقشِ کفِ پا
نہ کوئی اس کا نشاں
کوئی تلخی بھی تہہ جام نہ چھوڑی اس نے
زندگی باقی ہے!
ایک سنجیدہ ہنسی
سوچ سی دل میں بسی
تیز آتی ہوئی سانس

ذہن میں تھوڑے سے وقفے سے کھٹکتی ہوئی پھانس
اور دُکھتا ہوا دل
چوٹ تھی جس پہ لگی
چوٹ ویسی تو نہیں
درد باقی تو نہیں
لاکھ مانے نہ مگر
کچھ پشیمان سا دل
یوں بدل جانے پر
آپ حیران سا دل
اس کو کیا اپنا پتہ
یہ ہے اِنسان کا دل
کوئی پتّھر تو نہیں !
جس پہ مٹتی نہیں پڑ جائے جو اِک بار لکیر

کُندن

تپا ہوا یہ چہرہ جیسے بادِ سموم سے جُھلسا پھول
اور اس پر بھُوری آنکھوں کے دیپوں کی لَو
دیکھنے والوں کے دل کو گرماتی ہے
بات بھی اس سے کرو تو جلتے دل کی آنچ سی آتی ہے

ہنسی میں چمک چمک اُٹھے دل کا کُندن
دُنیا مٹا نہ پائی دل کا بھولا پن
نہ کوئی یار نہ میت نہ اس کا ساجن ہے
شہروں میں وہ رہے مگر بیراگن ہے
خوشی کے موتی پائے بھی تو کب ساتھ لیئے
یونہی چل دی اپنے خالی ہاتھ لیئے
جینے کا کچھ ڈھنگ نہ آیا خاک ہوئی
اپنی آگ میں جل کر پگلی راکھ ہوئی

مرقعہ

ہم نے دیکھی عجیب اک ناری
سانولا رنگ جامنی ساری
اور باتوں میں ایسی چنچلتا
چھوٹے رنگوں کی جیسے پچکاری
اودی بندیا بھوؤں کے بیچ جڑی
اور بھویں رات کی طرح کاری
جیسے کالا ہرن ہو مدھ بن میں
ایسی ہے اس کی آنکھ کجراری
لال ہونٹوں پہ ایسی مدرا ہے
ہو گئی جس سے سانجھ متواری
اس کی چمپا کلی گلے میں پڑی
گوری کلیوں کی جھولتی ڈاری

جیسے بدلی میں چاند لپٹے ہوں
ایسے کولھوں پہ گھومنی ساری!
ہیں مدوّر خطوط سر تا سر
چھانیاں گول اور گج بھاری!
لال پتھر کی لونگ ناک میں ہے
یا بھبوکا سی کوئی چنگاری
دیکھو لوگو یہ نار ہے کہ گھٹا
رنگ اور روپ سے بھری ساری
جھکے آکاش جس سے ملنے کو
ایسی نرمل دھنک کی اک دھاری

خواب اور تعبیریں

شہر پر کہر ٹھہری ہوئی !
کہر میں شہر ڈوبا ہوا !
جھیل کی سطح پر پھیلتی
خشک پیڑوں کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں کے جھروکوں میں ٹھہری ہوئی

میرے پیروں تلے چرمراتے ہوئے
کتھئی زرد نارنج پتوں کے ڈھیروں پہ سوتی ہوئی
اور خزاں کے سُلگتے ہوئے شعلہ ساں
سارے رنگوں کو دھیما بناتی ہوئی
آنسوؤں میں بھگوتی ہوئی دھندیں
خواب ہیں
خواب ہیں
خواب ہیں

اے والیِ ربِّ کون و مکاں

ڈوب گئی خاموشی میں مغرب کی اذاں
کیسا سکوت ہے، والیِ ربِّ کون و مکاں

الحمد للہ ربِّ العالمین
سب تعریف خدا کی، جو ہے بہت عظیم
بارش سے نکھرا نکھرا شفاف فلک
نیلا نیلا حدِ نظر تک پھیلا ہے
سبزے کی مخمل سے ڈھکی ہے نرم زمیں
الحمد للہ ربِّ العالمین
سب تعریف خدا کی، جو ہے بہت عظیم

کیسی سوچ نے میرے دل میں چٹکی لی
کیسے دھیان سے میری آنکھیں بھر آئیں
سینے میں کیوں سنّاٹا سا چھایا ہے
یہ میرے سجدے میں تذبذب کیسا ہے
لب پہ دُعائیں آ کے بنیں کیوں بے معنی
جیسے میرا اندر ہو سُنسان اُجاڑ
کوئی تو آئے کوئی تو آ کر دستک دے
کیسے کھولوں اپنے دل کے بند کواڑ

برف باری کی رُت

یہیں تو کہیں پر
تمہارے لبوں نے
میرے سرد ہونٹوں سے برفیلے ذرّے چُنے تھے
اسی پیڑ کی چھال پر ہاتھ رکھ کر
ہم اِک دن کھڑے تھے
یہیں برفباری میں ہم لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے
مہک تازہ بوسوں کی سر میں سمائے
ہم آغوشیِ جسم و جاں کے نشے میں
گئی برف باری کی رُت
اور پگھلتی ہوئی برف بھی بہہ گئی سب

یہاں کچھ نہیں اب
کہ ہر شے نئی ہے
ہٹا کر ردا برف کی گھاس لہرا رہی ہے
ہری پتّیوں کی گھنی ٹہنیوں میں
ہوا جب چلے تو
گئے موسموں سے گزرتی
ہماری ہنسی گونجتی ہے

ابرِ بہار

بادِ صبا کے دوش پہ اُڑتے
کبھی برستے ابرِ بہار
جانے والے دنوں کا کچھ ہم کو بھی پتہ دو
ایسے ہی اُڑتے گئے زمانے کہاں پُرانے
ذرا بتا دو

بارش سے نکھری مٹی میں عطر بسا ہے
ذرّہ ذرّہ مہک رہا ہے
اس خوشبو کو

اس جادو کو
کیسے اپنے دل میں بسا لوں
اس احساسِ بہار کو کیسے امر بنا لوں

وقت !
گزرتا وقت ، کسی کے بس میں نہیں ہے
کوئی بھی چاہت ، کوئی بھی آنسو ۔ اس کا دامنگیر نہیں ہے
مٹ جاتا ہے ۔ لمحہ لمحہ
وقت کوئی تصویر نہیں ہے

حسرت سے میں تکتی جاؤں مل مل ہاتھ
منظر منظر اڑتا جائے چھوڑ کے ساتھ

جس جھرنے پر ڈول رہی ہے
تیری میری جان کی کایا
اس جھرنے پر پتہ پتہ

بہتا جائے
کھوتا جائے
ہاتھ نہ آئے
ہاتھوں سے کب رُک سکتا ہے بہتا پانی
باقی ہے بس اس کی روانی
اسی میں اِک دن کھو جائے گی
لمحہ لمحہ بیت رہی ہے
بیت رہی ہے مری جوانی

میرے ہاتھ

دل پر لب سے رم جھم کرتی
کیسی برکھا برس رہی ہے
اس برکھا کے امرت رس سے
بھیگ چکی ہیں بھیگ چکی ہیں
کتنی چھپتی دھوپ اور بادل
یہ آکاش کے ننھے بالک
کھیل رہے ہیں ہنستے ہنستے
کلکاری بھرتے سبزے کو
شوخ ہوا گدگدا رہی ہے
میں بھی اپنے پنکھ جھٹک کر
پر تولوں اور بھروں اڑانیں
اپنے بدن میں خود کھو جاؤں

یہ تن کا آکاش یہ دھرتی
دھیرے دھیرے پھیل رہے ہیں
اور مرے ہاتھوں کے پکھیرو
یہ چنچل بے چین پرندے
ایک انوکھے راز سے بے کل
دھرتی میں کچھ ڈھونڈ رہے ہیں
ڈھونڈ رہے ہیں ایسے پل کو
جس کی کھوج میں دل رہتا ہے
جس پل دھرتی ملے گگن سے
وہ پل میرے تن کے باہر
کہیں نہیں ہے کہیں نہیں ہے
یہ پنچھی یہ نرم پکھیرو
جنموں سے دھرتی کے سنگی
اس کایا کے تال کنارے
دھیرے دھیرے ڈھونڈ رہے ہیں
کھوئے ہوئے پل کی کنکریا

میگھ دُوت

سنسناہٹوں کے ساتھ
گڑگڑاہٹوں کے ساتھ
آگیا !
پون رتھ پہ بیٹھ کر
میرا میگھ دیوتا
دوش پر ہواؤں کے
بال اُڑاتا ہوا
اس کا جامنی بدن
آسماں پہ چھا گیا
دُور تک گرج ہوئی
زمیں دہلنے لگی
آسماں سمٹ گیا
بڑی گھن گرج کے ساتھ

ٹوٹ کر برس پڑا
اور میں آنکھ موند کر
ہاتھ پسارے ہوئے
دوڑتی چلی گئی
انگ سے لگا رہی
نیل اس کے انگ کا

میں کہ بنتِ ہجر ہوں
مجھ میں ایسی آگ ہے
میں کہ میرے واسطے
وصل بھی فراق ہے
میری ایسی پیاس ہے
میگھ رس میں بھیگ کر
ہانپتی کھڑی کھڑی
کہہ رہا ہے دل مرا
یہی ہے
مدھر ملن کی گھڑی

سورۃ یاسین

یہ آخرِ شب کا سناٹا !
اس نیم اندھیرے رستے پر
جلدی میں قدم بڑھاتی ہوئی
میں ایک اکیلی عورت ہوں
بڑی دیر سے میرے تعاقب میں
اِک چاپ ہے جو چلی آتی ہے
گھر —— !
میرا گھر —— !
میں اپنے گھر کیسے پہنچوں
سوکھے حلقوم اور بیٹھتے دل سے سوچتی ہوں

شاید میں رستہ بھول گئی
یہ راہ تو میری راہ نہیں
اس راہ سے میں کب گزری تھی
سب گلیوں پر یہاں نام لکھے
اس گلی پہ کوئی نام نہیں
اور دور دور تک دم سادھے
یہ سارے گھر انجانے ہیں
لو پیلے چاند کا ٹکڑا بھی
کالے پتوں میں ڈوب گیا
اب کچھ بھی نہیں
بس میرے مُنہ میں خوف سے بھاری اور مفلوج زبان ہے
یا
تلووں سے اوپر چڑھتی ہوئی
مرے انگ انگ میں رچتی ہوئی
اِک خُنکی ہے

میرے اور تمہارے بیچ

میرے اور تمہارے بیچ
اس نیلی چادر کے سوا کچھ بھی تو نہیں
پھر یہ اکیلا گہرا میرے دل پر کیسے اتر رہا ہے
یہ گہرا سنّاٹا کیا ہے
ہر لمحہ کیوں سمٹ رہا ہے !

جو کچھ میرے دل میں ہے وہ رسموں کے رشتے سے ورا ہے
رسموں کا یہ رشتہ دیواروں سے ہم کو جھانک رہا ہے
گہرا سانس نہیں لے سکتی
میں بے چین ہوئی جاتی ہوں

بھیگی کالی رات کی بیٹی

اس کی آغوش میں کتنی گرمی ہے
میں کس طرح اس کی آغوش کو چھوڑ دوں
اس کے ہونٹوں کی مانوس خوشبو مجھے کر چکی ہے اسیر
اس کو معلوم کیا
میرے کمرے کے باہر بہت زور سے
میری کھڑکی پہ سر کو پٹکتی ہوئی
چل رہی ہے جو سرما کی تیکھی ہوا
گھر کے اُمڈی چلی آ رہی ہے جو پچھم سے کالی گھٹا
گھور اندھیرے کے سینے میں گونجی ہے جو
بوندیوں کی صدا
ان سے بچپن کا میرا بڑا ساتھ تھا

باکرہ

آسماں، تپتے ہوئے لوہے کی مانند سفید
ریگ سوکھی ہوئی پیاسے کی زباں کی مانند
سرسام تنم میں ہے، جسم میں ہے، جان میں ہے

سر بہ زانو ہوں جھلستے ہوئے ریگستاں میں
تیری سرکار میں لے آئی ہوں یہ وحشِ ذبیح!
مجھ پہ لازم تھی جو قربانی، وہ میں نے کردی

اس کی اُبلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک
اور سیہ بال ہیں بھیگے ہوئے خوں سے اب تک
تیرا فرمان یہ تھا اس پہ کوئی داغ نہ ہو

سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا ان دیکھا بھی
بے کراں ریگ میں سب گرم لہو جذب ہوا
دیکھ چادر پہ مری ثبت ہے اس کا دھبّا
اے خداوندِ کبیر
اے جبّار !
متکبر و جلیل !
ہاں ترے نام پڑھے اور کیا ذبح اسے
اب کوئی پارۂ ابر آئے کہیں سایہ ہو
اے خداوندِ عظیم
بادِ تسکیں ! کہ نفس آگ بنا جاتا ہے !
قطرۂ آب ! کہ جاں لب پہ چلی آئی ہے

آڈن کے نام

Life is just what it looks,
Love might win in the books,
Not here

یہ سچ ہے مرے فلسفی
میرے شاعر
وہ وقت آگیا ہے
کہ دُنیا کے بوڑھے فریبی معلّم کا جُبّہ پکڑ کر
نئے لوگ کہہ دیں
کتابیں بدل دو !
یہ جھوٹی کتابیں
جو ہم کو پڑھاتے چلے آرہے ہیں
حقیقت کے رُخ سے
یہ بے معنی، فرسودہ لفظوں کے پردے ہٹا دو

جلا دو
کتابیں جو ہم نے پڑھی ہیں
جلا دو !
کتابیں جو کہتی ہیں دُنیا میں حق جیتتا ہے
یہ سب کذب و بیہودہ گوئی مٹا دو
یہ سب کچھ غلط ہے
کہ ہم جانتے ہیں
کہ جھوٹ اور سچ میں ہمیشہ ہوئی جنگ

اور

جھوٹ جیتا ہے
کہ نفرت امر ہے
کہ طاقت ہے برحق
کہ سچ ہارتا ہے
کہ شیطان نیکی کے احمق خدا سے بڑا ہے

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا
چھو کے میرا بدن
اپنے بچّے کے دل کا دھڑکنا سُنو
ناف کے اس طرف
اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہو تم؟

بس — یہیں چھوڑ دو
تھوڑی دیر اور اس ہاتھ کو میرے ٹھنڈے بدن پر یہیں چھوڑ دو
میرے بے کل نفس کو قرار آ گیا
میرے عیسیٰ! مرے درد کے چارہ گر
میرا ہر موئے تن
اس ہتھیلی سے تسکین پانے لگا
اس ہتھیلی کے نیچے مرا لال کروٹ سی لینے لگا
اُنگلیوں سے بدن اس کا پہچان لو
تم اسے جان لو

چُومنے دو مجھے اپنی یہ اُنگلیاں
ان کی ہر پور کو چُومنے دو مجھے
ناخنوں کو لبوں سے لگا لوں ذرا
اس ہتھیلی میں منہ تو چھپا لوں ذرا
پھول لاتی ہوئی یہ ہری اُنگلیاں
میری آنکھوں سے آنسو اُبلتے ہوئے
ان سے سینچوں گی میں
پھول لاتی ہوئی اُنگلیوں کی جڑیں — چُومنے دو مجھے
اپنے بال، اپنے ماتھے کا چاند، اپنے لب
یہ چمکتی ہوئی کالی آنکھیں
یہ کچھ مُسکراتی، یہ حیران آنکھیں
مرے کانپتے ہونٹ، میری چھلکتی ہوئی آنکھ کو دیکھ کر کتنی حیران ہیں!

تم کو معلوم کیا — تم کو معلوم کیا
تم نے جانے مجھے کیا سے کیا کر دیا
میرے اندر اندھیرے کا آسیب تھا
یا کراں تا کراں ایک اَنمٹ خلا

یوں ہی پھرتی تھی میں
زیست کے ذائقے کو ترستی ہوئی
دل میں آنسو بھرے، سب پہ ہنستی ہوئی
تم نے اندر مرا اس طرح بھر دیا
پھوٹتی ہے مرے جسم سے روشنی

سب مقدّس کتابیں جو نازل ہوئیں
سب پیمبر جو اب تک اُتارے گئے
سب فرشتے کہ ہیں بادلوں سے پرے
رنگ، سنگیت، سُر، پھُول، کلیاں، شجر،
صبحدم پیڑ کی جھومتی ڈالیاں
ان کے مفہوم جو بھی بتائے گئے
خاک پر بسنے والے بشر کو مسرّت کے جتنے بھی نغمے سنائے گئے
سب رشی، سب مُنی، انبیا، اولیا
خیر کے دیوتا، حسن، نیکی، خدا ــــ
آج سب پر مجھے
اعتبار آگیا ــــ اعتبار آگیا

میرے لال

سوتا رہ!

میرے لال
میری گرم کوکھ میں
سوتا رہ!

کتنی دُور دُور تک
پھیل گئی جڑ تری
اور بہت گہری
اور بہت گہری
سارے تن میں تو ہے
میرے لال
میرے لال
سوتا رہ!

دیکھ مرے اندر
بہت گھنا
بہت بڑا
روتا ہوا جنگل
اس سیاہ بن میں
ایسے آگیا تو
کوئی ناگ جیسے
نرم جلد والا
سُرخ جلد والا
پھرے سرسراتا !
اس اُداس بن میں
تجھے کون لایا
اس اُجاڑ گھر کو
تو نے کیوں بسایا
میرے لال
میرے لال !

آکاس بیل

تو ہری بھری
آکاس بیل
مرے تن سے لپٹ کر بڑھے

اور بوند بوند
مرے انگ سے
جیون رس پیتی جائے

مُرجھا چلی میں
جیسے سوکھا پات
تو جیسے جیسے کِھلی

پڑ گئی زرد
مری سب لالی
ترے مُکھ گلاب کو ملی

مجھے رات کی کالک ملی
تجھے بھور کا پرکاش
میں گڑی جاؤں پاتال میں
تجھے کھینچ رہا آکاش

مت نیند سے چونک کے دیکھ مجھے
میں تجھے چھاتی سے لگاؤں
اور کانپتی اُنگلیوں سے
ترے کالے بال سُلجھاؤں

اس قدر تر و تازہ

اس قدر تر و تازہ !
تال کا کنول جیسے
چاندنی سجل جیسے
جیسے پھوٹتی کونپل
جیسے جھاگ سا بادل
چھو بھی لوں تو میلی ہو !
آ ہمک کے باہوں میں
تجھ کو گود میں بھر لوں

چوس لوں گی رس تیرا
میں تو کالا بھنورا ہوں

پر میں اپنے بوسوں سے
کس لئے ہراساں ہوں

دل کی تھاہ میں میرے
جو اُداس جذبہ ہے
اس سے کیوں ہوں شرمندہ

دوجاسایہ

تو مری گود میں کھِل کھِل ہنستی چمپے کی سی کلی سہی
تیری جان کی ساری کایا میری کوکھ میں ڈھلی سہی
اس کمرے میں ہم تنہا ہیں یہ دوجا سایہ کس کا ہے
بار بار کیوں تیرا چہرہ تاریکی میں کھو جاتا ہے
کیسا دُہری دھار کا خنجر پلنے کی ڈوری سے بندھا ہے
جس میں میرا لہو رچا تھا، اس تن پر کیوں لرز رہا ہے

لوری

کب سے سر پر تنی کھڑی ہے
کہیں نہ جانی
کالی رین
آدھی رین

پاگل تن کیوں کھوج رہا ہے
کھوج رہا ہے اندھیارے ہیں
اپنے انگ سے ٹوٹا انگ
ٹوٹے انگ کی مانگ جگاتی
کہیں نہ جانی

کالی رین
آدھی رین

بن جنگل کا مور بنی ہوں
آنسو پی کر ناچ رہی ہوں
یونہی رہے سر پر منڈراتی
کہیں نہ جاتی
کالی رین
آدھی رین

میرے سینے کے پیالوں میں
ناچ رہی ہے دودھ کی دھارا
میری کوکھ میں گونج رہی ہے
سن سن کرتی
کالی رین
آدھی رین

کب تک

کب تک مجھ سے پیار کرو گے
کب تک ــــ؟
جب تک میرے رحم سے بچّے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس سے آگے بھی تو کچھ ہے
وہ سب کیا ہے
کسے پتہ ہے
وہیں کی ایک مُسافر میں بھی
انجانے کا شوق بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے تب تک

بدن دریدہ

سرسرانے دو ذرا رات کے اس ریشم کو
اس میں ملفوف کسی عہد کی اِک لاش بھی ہے
رات جو جُرم بھی ہے جُرم کی پاداش بھی ہے
رات پانی کی طرح سر سے مرے بہتی ہے
مرے بالوں سے ٹپکتی ہوئی بُوندیں جیسے
مرے شانوں سے ڈھلکتی ہوئی گرتی جائیں
بند ہونے لگیں آنکھیں وہ نشہ طاری ہے

ہاں دہن میں ہے مرے ذائقہ ان بوسوں کا
جن کو چکھنے سے بھی انکار کیا تھا دل نے
مری رگ رگ میں وہ سیّال رواں ہے اب تک
جس سے بچ جانے پہ اصرار کیا تھا دل نے

مرے اطراف پتنگوں کی طرح اُڑتے ہیں
مرے بوسے، وہ مرے جھوٹ سے بوجھل بوسے
خون کی چھینٹیں اُڑاتے ہوئے گھایل بوسے
کب کی وہ کشمکشِ ذہن و زباں ختم ہوئی
اِک تڑپ باقی تھی سو دشمنِ جاں ختم ہوئی
اب تو وہ میری تھکاوٹ بھی مجھے چھوڑ چکی
وہ دریدہ بدنی جان کو بھی توڑ چکی!
اِک سیہ لہر بہائے لیئے جاتی ہے مجھے
خوں روانی سے بدن چھوڑ رہا ہو جیسے!
نیند ہے موت ہے یا یہ کوئی بے ہوشی ہے!
اب تو ہر سانس دمِ بازپسیں لگتی ہے!

زمین دوز ریل میں

اور اب، جب مرے پہلو میں نہیں کوئی نفس
آشنا، دوست، شناسا، مری دنیا کے مکیں
رہ گئے ہیں کہیں دور
اور
مرے پہلو میں
مری دزدیدہ، دبی آہ کو سننے والا
چونکنے والا، یہاں کوئی نہیں
اب نہ روکو اسے، آزاد تصور کو کرو
ذہن کو سوچنے دو

اور تخیّل کو بھٹکنے دو ذرا
ایسی باتیں، جنہیں سوچو تو نشہ آجائے
ایسے امکان کہ جینے کا مزا آجائے —
ایسی باتیں کہ نہیں جن کی اجازت تم کو
ذہن کو سوچنے دو
یہ تو کچھ جُرم نہیں
یہ تو نہیں کوئی گناہ
اور اگر ہے بھی تو پوشیدہ ہے

آؤ

آؤ!
آؤ
یہ سحر جو مجھ میں سمایا ہے
یہ سحر جو تم کو بھایا ہے
کیا کھینچ نہ لائے گا تم کو
میرے پہلو میں بٹھانے کو
اس گونج کے چکراتے لہراتے بھنوروں میں دھوکا کھانے کو
اور مجھ سے آ ٹکرانے کو

میں تپتی دھوپ میں اپنے بدن کا آئینہ چمکاتی ہوں
تم آؤ گے
آئینے سے ٹکراؤ گے
اور پیشانی پر زخم لئے رہ جاؤ گے

میں گاتی ہوں
اور آئینہ چمکاتی ہوں
اِک اندھے جادو کے بس میں
ہر لمحہ تمہیں بلاتی ہوں

عشق، تم جسکی تمنّائی تھیں

عشق، تم جس کی تمنّائی تھیں
کسی فردوس کا خوش رنگ پرندہ تو نہ تھا
یہ ہے تاریخ سے پہلے کا وہ اندھا عفریت
جو مرے جسم میں در آیا ہے
یہ درندہ جو مرے جسم کی دیواروں کو
اپنے آلودہ و نم ہاتھوں سے سہلاتا ہے
اندھے ہاتھوں سے جو ہر لحظہ مجھے چھوتا ہے
گرم سانسیں جو شب و روز بھرے جاتا ہے
بھاری پیکر بہت آہستہ سے جنباں ہے مگر
مجھ کو معلوم ہے کس جسُت کی ہے اس میں تڑپ
بڑی محتاط، بہت آہستہ
اُنگلیاں پھیر رہا ہے کہ نشاں پائے کوئی
ڈھونڈتا ہے کوئی دروازہ، کوئی راہ ملے

وصل اک کرن بن کر

وصل اک کرن بن کر
روح میں دمکتا ہے
جس کا ایک لمحہ ہے

وصل سے پرے لیکن
اک اُجاڑ سنّاٹا
ایک زرد ویرانہ
بڑھ رہا ہے مُنہ کھولے
یہ کرن نگلنے کو

تیری تیز آنکھوں میں
اِشتیاق کا شعلہ
اس طرح بھڑکتا ہے
میری جاں کا پروانہ
بے قرار سا ہو کر
اس طرح لپکتا ہے
پھر یہ کون قوّت ہے
کھینچتی ہے جو مجھ کو
تجھ سے دُور رکھتی ہے

پھر یہ کون شیطاں ہے
جو مجھے بچاتا ہے
جسم کے اندھیرے میں
آگ سی جلاتا ہے
موت جب کہ آنی ہے
میری ذات فانی ہے

ہاں میں اس کو پہچانی
مجھ کو کھینچنے والی
زندگی کی مشاطہ !

زندگی کی مشاطہ !
کیوں مجھے سجاتی ہے
جسم کے اندھیرے میں
آگ سی جلاتی ہے

وہ جو تم سب سا نہیں

وہ تو اک شاعرِ آوارہ و خود رفتہ ہے!
شبنمی گھاس سے بھیگا ہوا ملبوس اس کا
کُہنہ شب خیزی سے آنکھوں میں گلابی ڈورے
ہاتھ میں پھول بنفشہ کے لئے
بے نیازانہ چلا جاتا ہے
اس کے بالوں کو پریشان ہواؤں نے کیا
اس کو کچھ دھیان نہیں
اس نے دامن سے نہیں گھاس کے تنکے جھٹکے

ایک شب دیر تلک چاند کو دیکھا کیا وہ
لوگ کہتے ہیں کہ شاید تب سے
ہو گیا ہے کوئی سایہ اس پر
کوئی نہ کوئی تو ہے اس پہ اثر
وہ جو تم سب سا نہیں
اس کی ہے وجہ کوئی
وہ تو اک شاعر ہے

زبانوں کا بوسہ

زبانوں کے رس میں یہ کیسی مہک ہے !
یہ بوسہ کہ جس سے محبت کی صہبا کی اُڑتی ہے خوشبو
یہ بدمست خوشبو جو گہرا، غنودہ نشہ لا رہی ہے
یہ کیسا نشہ ہے !
مرے ذہن کے ریزے ریزے میں ایک آنکھ سی کھُل گئی ہے
تم اپنی زباں میرے منہ میں رکھے جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو
یہ بھیگا ہوا گرم و تاریک بوسہ
اماوس کی کالی برستی ہوئی رات جیسے اُمڈتی چلی آرہی ہے
کہیں کوئی ساعت ازل سے رمیدہ

مری روح کے دشت میں اُڑ رہی تھی
وہ ساعت قریں تر چلی آ رہی ہے
مجھے ایسا لگتا ہے
تاریکیوں کے
لرزتے ہوئے پُل کو
میں پار کرتی چلی جا رہی ہوں
یہ پُل ختم ہونے کو ہے
اور اب
اس کے آگے
کہیں روشنی ہے

ابد

یہ کیسی لذّت سے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رُک رُک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اُتر رہے ہیں
لہو کے گُنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہوا ہے
یہ چھوٹتی نبض، رُکتی دھڑکن، یہ ہچکیاں سی

گلاب و کافور کی لپٹ تیز ہو گئی ہے
یہ آبنوسی بدن یہ بازو کُشادہ سینہ
مرے لہو میں سمٹتا سیّال ایک نکتے پہ آ گیا ہے
مری نسیں آنے والے لمحے کے دھیان سے کھنچ کے رہ گئی ہیں

بس اب تو سرکا دو رُخ پہ چادر
دیئے بجھا دو

رجم

"ابنِ عمر سے روایت ہے کہ جب بدکاری کرنے والے جوڑے کا سنگسار کیا گیا تو مرد عورت پر جھک جھک جاتا اور اُسے پتّھروں سے بچاتا۔"

پاگل تن میں کیوں بستی ہے
یہ وحشی، تاریک آرزو
بہت قدیم اداس آرزو
تاریکی میں چھُپ جانے کی
اِک لمحے کو
اِک لمحے کو

ربِّ قہار ! یہ معجزہ کیا ہے !
تیرا خلق کیا ہوا آدم
لذّتِ سنگ کا کیوں خواہاں ہے
اس کی سحر زدہ چیخوں میں
یہ کس برزخ کا نغمہ ہے
کیا تھی بدن کے زخم کی لذّت
بے تابی سے یوں رقصاں ہے
ہر بُنِ مُو سے سُرخ و سیاہ لہو کا دریا اُبل پڑا ہے

اقلیما

اقلیما
جو ہابیل کی اور قابیل کی ماں جائی ہے
ماں جائی!
مگر مختلف
مختلف بیچ میں رانوں کے
اور پستانوں کے ابھار میں
اور اپنے پیٹ کے اندر
اپنی کوکھ میں
ان سب کی قسمت کیوں ہے
اک فربہ بھیڑ کے بچّے کی قُربانی

وہ اپنے بدن کی قیدی
تپتی ہوئی دُھوپ میں جلتے
ٹیلے پر کھڑی ہوئی ہے
پتّھر پر نقش بنی ہے
اس نقش کو غور سے دیکھو
لمبی رانوں سے اوپر
اُبھرے پستاں سے اوپر
پیچیدہ کوکھ سے اوپر
اقلیما کا سر بھی ہے
اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے
اور کچھ پوچھے!

مقابلۂ حسن

کولھوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے
سر میں بھی ہے جستجو کا جوہر
ننھا پارۂ دل بھی زیرِ پستاں
لیکن مرا مول ہے جو اِن پر
گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو ناپو!

وہ اک زنِ ناپاک ہے

وہ اک زنِ ناپاک ہے
بہتے لہو کی قید میں!
گردش میں ماہ و سال کی
دہکی ہوس کی آگ میں
اپنی طلب کی چاہ میں
زائیدۂ ابلیس تھی
چل دی اسی کی راہ میں
اس منزلِ موہوم کو
جس کا نشاں پیدا نہیں
سنگم وہ نور و نار کا ـــــ
جس کا پتہ ملتا نہیں
اُبلے لہو کے جوش سے

پستان اس کے پھٹ چکے
ہر نوکِ خارِ راہ سے
بندِ لحم سب کٹ چکے
اس کے بدن کی شرم پر
تقدیس کا سایہ نہیں
لیکن خدائے بحر و بر
ایسا کبھی دیکھا کہیں
فرمان تیرے سب روا
ہاں اس زنِ ناپاک کے
لب پر نہیں کوئی دُعا!
سر میں کوئی سجدہ نہیں

ایک عورت کی ہنسی

پتھریلے کہسار کے گاتے چشموں میں
گونج رہی ہے ایک عورت کی نرم ہنسی
دولت، طاقت اور شہرت، سب کچھ بھی نہیں
اس کے بدن میں چھپی ہے اس کی آزادی
دُنیا کے معبد کے نئے بُت کچھ کرلیں
سُن نہیں سکتے اس کی لذّت کی سِسکی

اس بازار میں گو، ہر مال بکاؤ ہے
کوئی خرید کے لائے ذرا نسکیں اس کی
اک سرشاری جس سے وہ ہی واقف ہے
چاہے بھی تو اس کو بیچ نہیں سکتی

وادی کی آوارہ ہواؤ ! آجاؤ ۔۔۔
آؤ اور اس کے چہرے پر بوسے دو
اپنے لمبے لمبے بال اُڑاتی جائے
ہوا کی بیٹی، ساتھ ہوا کے گاتی جائے

الزواٹر لیک ڈسٹرکٹ

چھایا جاتا ہے مری آنکھ کی بینائی پر
چادرِ آب کی خاموش نگاہی کا فسوں
پر سمیٹے ہوئے شاخوں میں ہوا سوتی ہے
چار اطراف کی گہرائیاں ہیں اور میں ہوں
سامری شام کی رنگین نظر بندی ہے

دل، مگر جانتا ہے
اِک گماں سا ہے کہ اس بھید بھرے پانی میں

مجھ کو مل جائے گا اس شوقِ گریزاں کا سُراغ
جس نے توڑا ہے مرے جسم کا تاریک سکوت
واہمہ ہے کہ اسی جھیل کی گہرائی میں
کوئی اثبات کا حرف
کوئی اقرار۔ کہیں میری صدا سُنتا ہے
دل مگر جانتا ہے

یہ مرا دل کہ فریب آشنا ہے

امربیل

یہ کیسی امربیل لپٹی دل سے
پیتی ہے لہو پھلواری کا ۔!

کوئی ساون جس کو راس نہیں
مٹّی نے جس کو جنم دیا
پھر چھوڑ دیا

اب ایسی امربیل لپٹی
پیتی ہے لہو

جل جانے تک
دھیرے دھیرے مر جانے تک

لیکن یہ مرے سینے کی جلن
جینے کی جلن
یہ یوں تو نہیں کُمھلائے گی
یہ امر بیل بن جائے گی

خلقت جن کی خوش رنگی دیکھ کے رشک کرے
وہ زہریلے پھل لائے گی
یہ یوں تو نہیں مُرجھائے گی

پچھلے پہر

میں جو ناگن کی طرح خاک پہ بل کھاتی ہوں
سر پٹکتی ہوئی پتھّر پہ جبیں گھستی ہوئی
اپنے اُگلے ہوئے زہراب کو خود پیتی ہوں
میں تو سمجھی تھی یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں
پر کہیں دُور کوئی حشر بپا ہو جیسے
یا رواں قافلۂ آبلہ پا ہو جیسے
میرے پاس آئے ہیں دیکھو مرے جھوٹے بوسے
خاک اُڑاتے ہوئے، ماتم کناں کیوں آتے ہیں

بازو پھیلائے ہوئے، گریہ وزاری کرتے
سینہ کوباں سرِ بالیں مرے نوحے پڑھتے
مرے بوسے مری پُرسش کے لئے آئے ہیں
آکے نزدیک گلے سے مرے لگ جائیں گے
مرے ماتھے پہ اُجالے کی طرح بکھریں گے
مری ذلّت کے چمکتے ہوئے ٹھنڈے تارے
میرے حلقوم میں خُنکی سے ہوئے آبِ حیات
مری مسموم زباں پر جو بنے انگارے
آستیں میں مری، اشکوں کی طرح جذب ہوئے
یہ مرے چاکِ گریباں کے مسکتے ٹانکے

آج شب

آج شب میں نیند پر پہرہ نہ دوں گی
چند یادوں، چند اندیشوں کی اِک سنگین کندھے پر اُٹھائے
"جاگتے رہنا" کا آوازہ لگاتی
صُبح دم تک
شہر کی گلیوں میں آوارہ نہ گھوموں گی
کہ
میں گہرے نشے میں ہوں
مرا بستر بُلاتا ہے مجھے

نیند، اے محبوب نیند
کب سے تو مجھ سے خفا ہے اور میں تجھ سے خفا ہوں
کونسی منزل پہ چھوٹا ساتھ اپنا
کون جانے
سب گلے شکوے بُھلا کر آج آتی ہے
تو آجا
آج میں لیٹوں گی تیرے بازوؤں میں
یہ اجازت دے کہ دل کی بات کہہ دوں
یہ اجازت دے کہ میں خود کو کروں تیرے حوالے
اپنا بوجھا توڑتا ہے جان میری
میری بیداری کا پیچیدہ شکنجہ
ذہن پر ہر دم کسا جاتا ہے
آجا

تلاوت

لو جاں کے کھُلے زخم
خوں کی مہک آئی
اس کلبۂ تاریک میں در آیا اُجالا
اِک ماند اُجالا
بے نُور اُجالا
دیوار پہ پھر سے وہی صورت اُبھر آئی

لے جاؤ کہیں دور
لے جاؤ یہ بے نور یہ بے آب اُجالا
لے جاؤ یہ ابہام
رہنے دو مرے کلبۂ احزاں میں سیاہی

روشن تھا صحیفہ
روشن تھا ہر اِک ورق
ہر لفظ کی قندیل
آنکھوں سے اُبلتے ہوئے اشکوں نے بجھائی

نذرِ فراق

بہت گراں ہے ابھی درد، ٹوٹتا ہے بدن
ہوا چلے تو رگ و پے میں ٹیس اُٹھتی ہے
کسک سی ہوتی ہے رہ رہ کے سرد پہلو میں
رُکی رُکی سی جو کالی گھٹا برستی ہے
چٹخنا جاتا ہے چنگاریوں بھرا بستر
یہ وہ چِتا ہے کہ جو ہو نہ پائے خاکستر

یہ بولتی ہوئی، اسرار کھولتی ہوئی رات

دبی دبی سی ہواؤں میں شاخساروں کی آہ
ڈھلکتی بوندوں کی دیوار و در سے سرگوشی

وہ آہٹیں کہ ادھورا نہ ہو کوئی خاکہ
بدن پہ جاگ اٹھیں رونگٹے، وہ امکانات

قریب آؤ تو میرے بدن کی گونج سُنو
مری رگوں میں لہو کیسے سرسراتا ہے
مرا لہو نہیں کس عجز سے بلاتا ہے

یہ بے قرار لہو، یہ مرے بدن کا عذاب
کہ جُرمِ زیست کی اِک مستقل سزا جیسے
یہ جس کے ساتھ ازل تک نباہ کرنا ہے
یہ جس کے ساتھ ہی جینا ہے اور مرنا ہے

میں تو مٹّی کی مورت ہوں

پھر نیم قدم شب آ پہنچی
ہیں ان بیکار خیالوں کی
رنگیلی کنچن مالا سے
کب تک کھیلوں

میں تو مٹّی کی مورت ہوں
کیا ہوا اگر اِس مورت میں
بہتا ہے لہو کا اِک دریا
اور دریا میں طغیانی ہے

وہ تیری یاد کا چاند چڑھا
بڑھ بڑھ کر لہریں آتی ہیں
ساحل سے ٹکرا جاتی ہیں

ان اُٹھتی گِرتی لہروں سے
کیا پھل پائے گا بدن میرا
میں تو مٹّی کی مورت ہوں
یہ مٹّی گھُلتی جائے گی
گھٹتا جائے گا بدن میرا

اِک لمحۂ عرفان

دوستو مجھ کو نہیں دعوئے پیغام بری
ہاں مگر کشف کے لمحات سے گزُری ہوں بھی
شب عجب سحر کے عالم میں مری آنکھ کھُلی
کہ زباں پر تھی مرے موت کی سی بے مزگی
چادرِ سرد پہ اِک نعش کی مانند تھی میں
اتنا بوجھل تھا لہو نبض بہت مدھم تھی
اس گھڑی سر میں نہ تھا دن کے خیالوں کا ہجوم
میری سانسوں میں مری ذات سمٹ آئی تھی

بعد از مرگ کے پیماں مرے دل میں گونجے
اور اُس لمحے میں اُن سب کی ضرورت نہ رہی
میں کہ وہ نقش ہوں ہر لمحہ مٹانا ہے جسے
میرا انجام فنا ہے تو چلو یوں ہی سہی
سرسراہٹ تھی فرشتوں کی نہ سرگوشئ غیب
چند سوکھے ہوئے پتّوں پہ ہوا ہنستی تھی
میں بھی اوہام کے اصنامِ خیالی پہ ہنسی
اور اسی نیند کے سیّال میں پھر ڈوب گئی
دل میں اس لمحۂ عرفان کی تائید لئے
دوسرے روز ملاقات کی اُمّید لئے

شہر والو سُنو

اس بریدہ زباں شہر میں قصّہ گو خوش بیاں آئے ہیں
شہر والو سُنو اس سرائے میں ہم قصّہ خواں آئے ہیں

شہرِ معصوم کے ساکنو! کچھ فسانے ہمارے سُنو
دُور دیسوں میں ہونا ہے کیا ماجرے آج سارے سُنو
وہ سیاہ چشم پستہ دہن سیم تن نازنیں عورتیں
وہ کشیدہ بدن، سبز خط، خوش قطع ماہرو نوجواں
اور وہ جادوگری ان کی تقدیر کی
وہ طلسمات، سرکار کی نوکری
ایک انوکھا محل
جس سے گزرا تو ہر شاہزادے کا سر خوک کا بن گیا
درسگاہوں میں وہ جوق در جوق جاتے ہوئے نوجواں
وہ تبسم فشاں ان کی پیشانیاں ہائے کھوئیں کہاں
آن کی آن میں بیر اُٹتے ہوئے

ضعف سے ان کی مژ گاں تلک جھڑ گئیں
جسم کیا روح پر جھرّیاں پڑ گئیں

اور وہ شہزادیاں
کچّی عمروں میں جو سیر کرنے گئیں
باغ کا وہ سماں
عشق کے پھول کھِلتے ہوئے دُور تک ریشمی گھاس میں
وہ فسوں ساز خوشبو بھٹکتی ہوئی ان کے انفاس میں
افسروں اور شاہوں کی آغوش میں
ان کے نچلے بدن کیسے پتھرا گئے

وہ عجب مُملکت
جانور جس پہ مدّت سے تھے حُکمراں
گورعایا کو اس کا پتہ تک نہ تھا
اور تھا بھی تو بے بس تھے لاچار تھے
ان میں جو اہلِ دانش تھے مدّت ہوئی مر چکے تھے
جو زندہ تھے بیمار تھے

کچھ عجب اہلِ فن بھی تو تھے اس جگہ
سامری سحر سے روگ میں مُبتلا
خلعتِ شاہ تھی ان کی واحد دوا
بیشتر قابِ سُلطان کے خوشہ چیں
گیت لکھتے رہے گیت گاتے رہے
عہدِ زرّیں کے ڈنکے بجاتے رہے

کن وزیروں سے ان کی رقابت رہی
اور کام آئی کس کس کے جادوگری
شاد کا جب کھٹولا اڑایا تو پھر کیا ہوئی وہ پری ؟

جمع کرتے تھے ہم ایک رنگیں فسانہ عجب داستاں
آستینوں میں دفترِ نہاں لائے ہیں
شہر والو سنو

مہاجر

یہ نیلے پیلے غبّارے
خود اپنے زور سے پھوٹ گئے

نا اندیشی کی بلندی سے
دھجّیاں ربڑ کی مردہ کھال کی طرح گریں
کس تیزی سے !

بے جان ربڑ کے یہ ٹکڑے
کس سمت ٹھکانہ پائیں گے

مٹّی سے ان کو پیار نہیں
مٹّی میں نہیں مل پائیں گے
اور نتھرے ستھرے پانی کا
ہر قطرہ ان سے کہتا ہے
جو پتھّر کاٹ کے نکلا ہے
وہ تازہ پانی کا دھارا
من مانے رُخ پر بہتا ہے
مٹّی اور پانی سے عُبّارے بہت خفا ہیں

پلاٹ

میں اپنے حمل کا بوجھ لئے
دھرتی کو ڈھونڈتی آئی تھی
پر دھرتی کہاں ہے میں جس پر یہ بوجھ اُتار کر بیٹھ سکوں
وہ جنموں کی سنگی میری
جس کی مٹّی میں جذب ہوا تھا دودھ مرا
وہ جس کی اتھاہ گہرائی میں بے کل ہیں نمو کی تحریکیں
جو اپنے پھوٹتے انکھوؤں سے
بوجھل بھی ہے
شاداب بھی ہے
جو کوکھ کی طرح امر ہے
اور جذبے کی طرح آزاد بھی ہے

وہ زمیں
کہ جس سے کان لگا کر سُنتی تھی
اس گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک
جو نظروں سے اوجھل، آنا تھا ایسا ویر سوار لیئے
جس کے آنے کا وعدہ تھا

لیکن یہ زمیں
مجبور زمیں
جاگیر زمیں
وہ زمیں نہیں ـــــ
یہ مجھ کو نہیں پہچانے گی
جنموں سے مری بچھڑی سنگی
کسی سوچ میں ہے

سن سکھی ذرا
ہم کان لگا کر سُنتے ہیں

شائد کہ کہیں سے آتی ہو
اس گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک
جو نظروں سے اوجھل
آتا ہے ایسا ویر سوار لیئے
جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں

بھارت ناٹیم

اُٹھتے ہیں سُبک ایڑیوں کے نرم کنول
نازک ٹخنے سے جھانجھ ٹکراتی ہے
گج گامنی، کامنی کمر، لجاتی چھاتی
مسکاتی ہے، شرما کے ٹھٹک جاتی ہے

دو نین اشارہ کر کے جُھک جاتے ہیں
مسکان سے بھیگے ہونٹ تھرّاتے ہیں
کھلتے ہیں کنول انگلیوں کی جنبش میں
باہوں میں دھنک کے قوس ڈھل جاتے ہیں

یہ جسم کہ لہرانی ہے اک نور کی موج
دھارا ہے ندی کا کہ لچکتی ہے کمر
پیڑو پر پڑ رہی ہے اک سلوٹ سی
یا لہریں لے رہا ہے رس کا ساگر

گدرائے ہوئے آم کے باغوں کی مہک ___
ساون کے میگھ رس کی بوندوں کی کھنک
گیہوں کی بالیوں کا ادھ کچّا دودھ
اودا ہٹ جامنوں کی، موروں کی پکار
پُروائی کے جھونکوں میں لچکتا ہوا دھان
بھارت ناٹیم ناچتی ہے ناری
انگڑائی لے کے جاگ اُٹھا ہندوستان

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۷۳ء

(جب راولپنڈی میں حزبِ اختلاف کے جلسے پر
چار گھنٹے تک فائرنگ ہوتی تھی ———)

کب سے دل سہما ہوا تھا
کب سے اِک چُپ سی لگی تھی
بات کرنے سے بھی ڈر لگتا تھا
کب سے اِک بارِ سماعت تھی ہنسی بچّوں کی
دل کو گھیرے ہوتے رہتے تھے شکوک و اوہام

دفعتاً آج یہ مغرب سے چلی کیسی ہوا
آج مٹّی سے اُٹھا کیسا لہو ریز غبار
جا بجا سر کو پٹکتا ہوا دیوانہ وار

شہر کے کوچہ و بازار میں بل کھاتا ہوا
راہگیروں سے لپٹتا ہوا، چکراتا ہوا
بند دروازوں پہ دیتا ہوا پاگل دستک
کسی پرچم کی طرح شہر پہ لہراتا ہوا

آج اندیشوں نے یک لخت مجھے چھوڑ دیا

یک بیک آج، مرے دل سے مٹا خوف و ہراس
آج سینے میں بھڑکتی ہے عجب خون کی پیاس
اِک بگولے کی طرح رقص کو جی چاہتا ہے

غم واندوہ سے پامال و شکستہ تن ہو
آؤ اے ہم وطنو ! رقص کرو، رقص کرو
غیظ کا رقص، بکھرتے ہوئے پندار کا رقص
رنج و رسوائی کا، اُمیدِ نگوں سار کا رقص
پیرہن چاک کرو مصلحت اندیشی کا

اپنے اشکوں کی برستی ہوئی بوچھاڑ میں آؤ
یہ جھجکتے ہوئے بازو تو ہوا میں لہراؤ
جسم کو رقص کے گرداب میں چکرانے دو

شہر در شہر جو ہم رقص میں لہرائیں گے
حلقہ در حلقہ بھنور پڑتے چلے جائیں گے

جسم و جاں رقص کریں، نطق و زباں رقص کریں
تلملاتا ہے لہو آج مری رگ رگ میں

سمندر اور آدمی

دُور سے آتا تھا اُٹھتی گرتی لہروں کا شور
ساگر کا منہ چوم رہا تھا رات کا بھیگا نیل
چار طرف اُڑتی تھی گیلی ریت کی سوندھی باس
اس نے کہا "اچھی لگتی ہے ساگر کی آواز"

وہ ساگر کی بوند

ساگر، جس کے نمک سے چمکا اس کا سلونا رنگ
جس کی بے کل لہر نے ڈھالا اس کا چھریرا انگ
جس کی ہواؤں میں ہے اس کی سانسوں کا آہنگ

دُور سے آتا تھا اُٹھتی گرتی لہروں کا شور۔
جس کے پرے پھیلا تھا بیتے قرنوں کا سناٹا
ساگر سمٹ رہا تھا

پہلی بار

پہلی بار
پیار کے بعد
اک دوجے کی باہوں میں
اپنے دماغ اور بدن کی عُریانی کے آئینہ خانے میں
اتنے ننھّے!
اتنے نازک
سانس جھجک کر لیتے ہیں ہم
کانچ کے پُتلے ٹوٹ نہ جائیں —

ساحل کی ایک شام

زائیدۂ بحر ایک بچّہ
ساحل پر سرنگوں کھڑا ہے
وہ تم سے میری ہمکناری
حیراں آنکھوں سے دیکھتا ہے

اتنا گمنام، اتنا تنہا
بے خانماں سا یہ ایک بچّہ
جس کا کوئی گھر کہیں نہیں ہے
جس کی وارث زمیں نہیں ہے
جیسے جھوٹی غذا کا دونا
ساحل پہ کہیں پڑا ہوا ہے

جیسے گیلی ہوا کی زد میں
میلے کاغذ کا ایک ٹکڑا

یہ طفل، سمندروں کا جایا
موتی کی طرح زمیں پہ آیا
کنکر کی طرح ہے ٹھوکروں میں

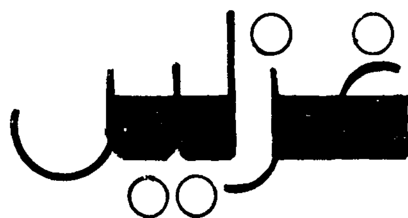
ساحل کی سنگ دل ہوا میں
کیسا زہراب بہہ رہا ہے
یہ اس زہراب کو پیئے گا
یہ اس زہراب پر جیئے گا
اس کے سوکھے ہوئے لبوں پر
لہروں کے نمک کا ذائقہ ہے
بس ریت لپٹ سکی ہے اس سے
بس لمس ہوا کا جانتا ہے
وہ تم سے میری ہمکناری
بُجھتی آنکھوں سے دیکھتا ہے

جاناں، مرا ہاتھ ہاتھ میں لو
ہے اس کے لبوں پہ آنے والی
جینے سے زیادہ تلخ گالی
گالی جو راکھ بن گئی ہے
ہونٹوں پر ہی بکھر گئی ہے

اس راکھ میں گر کوئی شرر ہے
شاید شعلہ بھڑک ہی اُٹھے
شاید کسی شام ساحلوں پر
لگ جائے مشعلوں کا میلہ
شاید یہ سمندروں کے جائے
مِٹّی سے خراجِ زیست مانگیں

سہج چلی پروائی

سرسوں کے پھولوں سے، گیہوں کی بالی سے سجایا
دھرتی ایک کنواری تم نے دُلہن اسے بنایا
رس برساتے بادل گزرے، سہج چلی پروائی
تم کو چھاتی سے لپٹاتے دھرتی کب شرمائی
ہاتھ تمہارے چھوئیں تو اُس کے انگ کو روپ سُہائے
ان ہاتھوں سے کیا گھبرانا، نہیں یہ ہاتھ پرائے
وہ دھرتی جو سدا تمہاری سیوا کرتی جائے
سر پر ہاتھ دھروگے تم، بیٹھی ہے آس لگائے
دن ڈوبا ہل پاس کھڑا ہے، دیکھو یہ انیائے
اس کی کوکھ میں بیج تمہارا، دوجا کیوں پھل پائے
یہی ہے ماتا، یہی ہے پتنی، یہی تمہاری بیٹی
پاس وڈیروں کے مت چھوڑو، بڑی اُداس رہے گی


غزلیں

کبھی دھنک سی اتر تی تھی ان نگاہوں میں!
وہ شوخ رنگ بھی دھیمے پڑے ہواؤں میں!
میں تیز گام چلی جا رہی تھی اُس کی سمت
کشش عجیب تھی اس دشت کی صداؤں میں
وہ اِک صدا جو فریبِ صدا سے بھی کم ہے
نہ ڈوب جائے کہیں تُند رو ہواؤں میں!
سکوتِ شام ہے اور میں ہوں گوش بر آواز
کہ ایک وعدے کا افسوں سا ہے فضاؤں میں
مری طرح یونہی گُم کردہ راہ چھوڑے گی
تم اپنی بانہہ نہ دینا ہوا کی باہوں میں!
نقوشِ پاؤں کے لکھتے ہیں "منزلِ نایافت"
مرا سفر تو ہے تحریر میری راہوں میں



بہ پیرہن جو مری رُوح کا اُتر نہ سکا
تو نخ بنخ کہیں پیوستہ ریشۂ دل تھا
مجھے مآلِ سفر کا ملال کیوں کر ہو
کہ جب سفر ہی مرا فاصلوں کا دھوکا تھا
میں جب فراق کی راتوں میں اس کے ساتھ رہی
وہ پھر وصال کے لمحوں میں کیوں اکیلا تھا
وہ واسطے کی طرح درمیاں کبھی کیوں آئے
خدا کے ساتھ مرا جسم کیوں نہ ہو تنہا
سراب ہوں میں تری پیاس کیا بجھاؤں گی
اس اشتیاق سے تشنہ زباں قریب نہ لا

سراب ہوں کہ بدن کی یہی شہادت ہے
ہر ایک عضو میں بہتا ہے ریت کا دریا
جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے
جو میرے دل میں ہے اس حرفِ رائگاں پہ نہ جا
جسے میں توڑ چکی ہوں وہ روشنی کا طلسم
شعاعِ نورِ ازل کے سوا کچھ اور نہ تھا



پتھر سے وصال مانگتی ہوں
میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں
شاید پاؤں سراغِ اُلفت
مُٹھی میں خاک بھر رہی ہوں
ہر لمس ہے جب تپش سے عاری
کس آنچ سے یوں پگھل رہی ہوں
وہ خواہشِ بوسہ بھی نہیں اب
حیرت سے ہونٹ کاٹتی ہوں
اِک طفلکِ جستجو ہوں شاید
میں اپنے بدن سے کھیلتی ہوں
اب طبع کسی پہ کیوں ہو راغب
انسانوں کو برت چکی ہوں

چھوٹی وصل و فراق سے ہیں
انجان ڈگر پہ چل رہی ہوں
کیوں کھوٹ ہے میری زندگی میں
میں اس کا جواب دے رہی ہوں
کیوں جھوٹے ہیں میرے شب و روز
میں ان کا جواز بن گئی ہوں!
ہاں میرے خمیر میں کجی تھی
اب خوش ہوں کہ اب بھٹک رہی ہوں
اس گریۂ زار پر نہ جاؤ
میں دل ہی دل میں ہنس رہی ہوں
وہ راز جسے نہ کھول پاؤں--!
میں ایسا راز چاہتی ہوں
کب ہوگا ختم یہ تماشہ
اتنی کچھ تو بتا چکی ہوں



جو مجھ میں چُھپا میرا گلا گھونٹ رہا ہے
یا وہ کوئی ابلیس ہے یا میرا خدا ہے

جب سر میں نہیں عشق تو چہرے پہ چمک ہے
یہ نخل خزاں آئی تو شاداب ہوا ہے

کیا میرا زیاں ہے، جو مقابل ترے آجاؤں
یہ امر تو معلوم کہ تو مجھ سے بڑا ہے

میں بندہ و ناچار کہ سیراب نہ ہو پاؤں
اے ظاہر و موجود مرا جسم دُعا ہے

ہاں اس کے تعاقب سے مرے دل میں ہے انکار
وہ شخص کسی کو نہ ملے گا نہ ملا ہے

کیوں نورِ ابد دل میں گزر کر نہیں پاتا
سینے کی سیاہی سے نیا حرف لکھا ہے



مژدہ کہ جانِ سوختہ پانے لگی نئی جِلا
ذوقِ فسردہ، آتشِ رشک سے پھر سُلگ اُٹھا
پھر وہی کیفِ خواب تھا، پھر وہی زہر کی مہک
ایک سیاہ ناگ سا دل پہ تمام شب پھرا
میرے لہو میں ہیں عجب راز کی سرسراہٹیں
کون ہے میرا راز داں تجھ سے جو ہم کنار تھا
فاصلہ ہے بقدرِ شوق پیشِ نظر ہے رہگزر
پھر وہ کنارۂ اُفق پاؤں کو کھینچنے لگا



یہ کس کے آنسوؤں نے اس نقش کو مٹا یا
جو میرے لوحِ دل پر تو نے کبھی بنا یا
تھا دل جب اس پہ مائل تھا شوق سخت مشکل
ترغیب نے اسے بھی آسان کر دکھا یا
اک گرد باد میں تو اوجھل ہوا نظر سے
اس دشتِ بے ثمر سے، جُز خاک کچھ نہ پایا
اے چوبِ خُشک صحرا۔ وہ یادِ شوق کیا تھی
میری طرح برہنہ جس نے تجھے بنا یا
پھر ہم ہیں نیم شب ہے، اندیشۂ عبث ہے
وہ واہمہ کہ جس سے تیرا یقین آیا!

سروادئ سینا

فیض احمد فیضؔ کے کلام کا یہ مجموعہ اس قدر مقبول ہے کہ تین سال کی مختصر مدّت میں اس کے تین ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور اسی سال چوتھے ایڈیشن کی نوبت بھی آجائے گی۔

اس مجموعے میں فیضؔ کی مشہور نظمیں زندان زندان شور اناالحق، یوں سجا چاند، دلدار دیکھنا' دُعا وغیرہ شامل ہیں فیضؔ کے کلام کے بارے میں کسی اشتہاری مضمون کی ضرورت ہی نہیں، اُردو ادب کی تاریخ فیضؔ کے ذِکر کے بغیر مکمل ہی نہیں سمجھی جا سکتی اور برسوں تک اُردو ادب کے شائقین فیضؔ کے کلام سے محظوظ ہوتے رہیں گے۔

زیرِ طبع

فہمیدہ ریاض کا تیسرا شعری مجموعہ

دُھوپ

"پتھر کی زبان" اور "بدن دریدہ" کی شاعرہ کا نیا مجموعہ
جس میں فہمیدہ ذہنی ارتقا کی ایک نئی منزل پر دکھائی
دیتی ہیں اور اِن کی شاعری کا رُوپ نیا نکھار
لئے ہوئے ہے۔